ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

بزرگان دیوبند اور ان کی خدمات ملّی

تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں

ہم یہاں ڈاکٹر قریشی مرحوم کی کتاب "علماً..... میدان سیاست میں' سے چند اقتباس "بزرگان دیوبند کی تاریخ خدمات ملی" کے متعلق پیش کرتے ہیں لیکن ایک وضاحت بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر قریشی مرحوم علی گڑھ مکتبہ فکر کے مورخ ہیں ان کا ایک نقطہ نظر ہے انہوں نے اپنے نقطہ نظر سے تاریخ کو دیکھا اور رائے قائم کی ہے لیکن کئی باتوں میں مرحوم کی رائے سے اختلاف کے باوجود ہم ان کی عالمانہ اور مورخانہ حیثیت سے اختلاف نہیں کر سکتے انہوں نے معرکہ شاملی کے وقوع بزرگان دیوبند کے بروقت اقدام' مجاہدانہ کردار اور ناکامی کے بعد نئی حکمت عملی اور دارالعلوم دیوبند کے مقصد قیام کے بارے میں راست انداز فکر اختیار کیا ہے۔ لیکن بعض مسائل میں اس کے روپے اور بہت بعد کے حالات میں بزرگان دیوبند کے سیاسی مسلک پر (جو ان اقتباسات میں زیر بحث نہیں آیا ہے شدید اعتراضات بھی کئے ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر صاحب کی ان آرا کو ہم درست نہیں سمجھتے۔ لیکن ان پر نقد و نظر کا یہ موقع نہیں۔ اس کیلئے ہمیں کسی دوسری صحبت کا انتظار کرنا چاہیے" (ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہانپوری)

معرکہ شاملی اور اس کا قائد :

"بغاوت روھیلکھنڈ اور دوآب کے مختلف علاقوں میں پھیل گئی۔ مسلم تعلیم کا ایک مرکز موجودہ اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر میں تھانہ بھون تھا۔ یہاں کے رہنما عالم حاجی امداد اللہ تھے' جن کی عظمت ایک عالم فاضل الہیات اور صوفی کی حیثیت سے برعظیم کے تمام تعلیمی اور دینی حلقوں میں تسلیم کی جاتی تھی ان کے شاگردوں' مریدوں اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا وہ مولانا نصیر الدین دھلوی کے مرید تھے جنہوں نے سندھ میں تحریک جہاد کی تنظیم کی تھی اور پھر قبائلی علاقے میں جاکر مجاہدین کی چھاؤنی میں داخل ہو گئے تھے۔ حاجی امداد اللہ کا تعلق تحریک جہاد سے اس وقت کے بعد برابر رہا تھا جب یہ تحریک ان کے مرشد کے ماتحت دوبارہ جاری کی گئی تھی وہ اس وقت شاہ اسحاق سے' جو خاندان شاہ ولی اللہ کے نمائندے تھے مشورہ کرنے کے لئے مکہ گئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو انگریزوں کے خلاف جہاد کی تلقین میں مشغول ہو گئے اور یہ کہا کہ بغاوت کے لئے کھڑے ہو جانے کا وقت اب پختہ ہو گیا ہے جب اس ضلع میں بغاوت ہو گئی تو حاجی امداد اللہ نے تھانہ بھون میں

سربرآوردہ علماء کا ایک جلسہ منعقد کیا اور جہاد کی تنظیم کی۔ انہیں قائد منتخب کیا گیا۔ یہاں بھی اختلاف رائے کا اظہار ابتداً اسی بنیاد پر کیا گیا کہ انگریزوں سے لڑنے کے لئے کافی وسائل دست یاب نہیں تھے، مگر یہ اعتراض مسترد کر دیا گیا۔ رہنماؤں نے عاجلانہ تیاریاں کیں اور شاملی کے خلاف کوچ کر کے اس پر قبضہ کر لیا مجاہد فوج کی کمان مولانا ضامن علی نے کی اور ان کی مدد مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کی۔ ان کی مہم یہیں ختم ہو گئی، کیونکہ اب جنگ کا رخ انگریزوں کی موافقت میں پلٹ گیا تھا سقوط دھلی نے باغیوں، ان کے حامیوں اور دوسرے لوگوں میں ایک عظیم نفسیاتی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ شاملی پر مجاہدین کے قبضے کے بعد جلد ہی وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس کے بعد انگریزی فوج نے خود تھانہ بھون کی طرف کوچ کیا جس کے دفاع کی تیاریاں بعجلت تمام کی گئیں۔ انگریزوں کی طرف سے پہلے محاصرہ ناکام ہو گیا اور وہ پسپا ہوئے۔ اگلی مرتبہ وہ زیادہ بڑی فوج اور زیادہ اسلحہ لیکر آئے۔ دفاع کرنے والوں کے پاس صرف ایک توپ، چند توڑے دار بندوقیں اور تلواریں تھیں۔ پرجوش دفاع کے باوجود، دیوار توڑ دی گئیں دروازے اڑا دیئے گئے اور مکانات لوٹ لئے گئے۔ بعض بڑے مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ رہنما بچ کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ نے مکہ جانے کی راہ بڑی مشکل سے نکالی کیونکہ انگریزی حکام انہیں گرفتار کرنے کے لئے بہت بے چین تھے دوسرے دو رہنما مولانا عبدالغنی اور مولانا رحمت اللہ بھی مکہ پہنچ گئے موخر الذکر کو پہلے دھلی بھیجا گیا تھا کہ وہ وہاں کی صورت حال کا اندازہ لگائیں اور ان کی روداد پر تھانہ بھون میں جہاد کا انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کو ایک منصوبے کے مطابق پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس بیان میں یہ اضافہ اور کیا جا سکتا ہے کہ مولانا رحمت اللہ نے ایک بغاوت کیرانہ میں منظم کی تھی جسے کچل دیا گیا اور وہ دہلی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے وہاں سے انہوں نے سورت کا سفر براہ اجمیر تانہ کیا اور اس کے بعد مکہ روانہ ہو گئے۔ (علماء میدان سیاست میں: ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، کراچی ۱۹۹۴ء ص ۴۵۔ ۲۴۳)

شاملی میں ناکامی اور نئی حکمت عملی:

دارالعلوم دیوبند کا قیام، مدرسہ رحیمیہ کی نشاۃ ثانیہ اور روح حرمت کا احیاء:

"شاہ محمد اسحاق ۱۸۲۴ء میں شاہ عبدالعزیز کے جانشین ہوئے اور ۱۸۴۱ء میں حجاز ہجرت کر گئے جہاں ۱۸۴۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے کام کی ذمہ داری ان کے بھائی مولانا محمد یعقوب نے سنبھالی مگر یہ واضح نہیں ہے کہ ہندوستان میں مولانا امداد اللہ نے مولانا مملوک علی کی جگہ کب لی۔ یہ تبدیلی ۱۸۴۶ء کے لگ بھگ ہوئی ہو گی کیونکہ یہ دونوں تقرر شاہ محمد اسحاق نے کئے تھے اور وہ ان تبدیلیوں کو اپنی روانگی سے بہت زیادہ

قبل علم میں نہیں لا سکتے تھے۔ اس کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں بغاوت شروع ہوئی تو مولانا امداد اللہ تھانہ بھون میں تھے اور یہ کہ شاملی کی مہم ان ہی کی قیادت میں بروئے کار آئی۔ جب انگریز فاتح کی حیثیت سے ابھرے تو مولانا امداد اللہ مکہ کی طرف گریز کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں آئندہ طریق کار کے تعلق مشورے پھر شروع ہوئے۔ یہ امر بالکل واضح تھا کہ برعظیم میں سیاسی حالات کسی تحریک کے لئے بالکل مساعد نہیں ہیں اس لئے سوائے اس کا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہے تھا کہ آزادی کی روح زندہ رکھی جائے اس مقصد کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ مدرسہ رحیمیہ کے اس انداز پر ایک مدرسہ قائم کیا جائے جو اس نے شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے زیر ھدایت پیدا کیا تھا اس نے اپنے اساتذہ کے علم و فضل اور اپنی تعلیم کی عمدگی کے لئے تمام دنیائے اسلام میں شہرت حاصل کی تھی۔ اس نے ایک ایسے معاشرے میں دین داری اور سوزِ روحانی کی مشعل بلند رکھی تھی جو بے کار عیش و عشرت اور اخلاقی انحطاط کے مضعف اثرات سے مغلوب ہو گیا تھا اور اسلام کی سابقہ عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی دلی آرزو پیدا کی تھی۔ ۱۸۵۸ء میں دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد جب انگیزوں نے اس مدرسے کی عمارتیں مسمار کر دی تھیں تو اس کا وجود ختم ہو گیا تھا۔ اس نئے مدرسے کو دہلی یا اس اعتبار سے کسی بھی بڑے شہر میں قائم کرنا اس لئے خلاف مصلحت سمجھا گیا کہ اس صورت میں اس کی سرگرمیاں اجنبی حکومت کی ناپسندیدہ توجہ جذب کریں گی۔

قیام مدرسہ کیلئے دیوبند کا انتخاب :

اس کے محل وقوع کے لئے دیوبند کو منتخب کیا گیا جو گاؤں سے بمشکل بڑا اور مواصلات کی شاہراہوں سے دور 'ایک پر سکون قصبہ تھا۔ چونکہ قصبے میں رہائش کی آسانیاں میسر نہیں تھیں اس لئے مدرسے کو لامحالہ اقامتی ہونا تھا جس میں اساتذہ اور طلبہ کی برادری کے لئے سکونت کا انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے منصوبہ مرتب کیا اور بعد میں یہ ادارہ بغیر کسی دھوم دھڑ کے اور نہایت ادنی شروعات سے قائم کر دیا۔ بہت جلد عطیات آنے شروع ہو گئے اور یہ ادارہ روز بروز زیادہ قوت حاصل کرنے لگا مولانا محمد قاسم کو یہ مدرسہ ۱۸۶۶ء میں قائم کرنے کے لئے سات سال کام کرنا پڑا اور اس کے بعد انہوں نے اپنی تمام زندگی اس کی تعمیر کے لئے وقف کر دی۔

منصوبے کا لازمی حصہ :

یہ ادارہ اسلامی علوم کی تعلیم حنفی مذہب کے مطابق دیتا تھا اور اس کی کوشش یہ تھی کہ اس کے فارغ التحصیل طلبہ کو اتنا ضروری علم حاصل ہو جائے کہ وہ مساجد کے ائمہ اور مکاتب و مدارس کے اساتذہ کی خدمت انجام دے سکیں۔ یہ اس منصوبے کا ایک لازمی حصہ تھا کیونکہ اسی طریقے سے دیوبند کا پیغام برعظیم کے مختلف

حصوں تک پہنچ سکتا تھا یہ علمی درس گاہ اس مقصد میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئی اور اس کا اثر نہ صرف برعظیم کے بعید ترین گوشوں تک پہنچا بلکہ قبائلی علاقوں اور افغانستان میں بھی پھیل گیا۔ اعلیٰ تعلیمات اور تخصص کی آسانیاں وہاں ہمیشہ موجود رہی ہیں مگر ان کیلئے نصاب تعلیم کبھی مقرر نہیں کیا گیا اور ممتاز طلبہ اپنی ہدایت ایسے اساتذہ سے حاصل کرتے ہیں جو متعلقہ مضمون میں اختصاصی تبحر رکھتے ہیں۔ پہلے نصاب تعلیم سات سال پر پھیلے ہوئے تھا اب فارغ التحصیل ہونے میں آٹھ سال لگتے ہیں اور یہی واحد سند ہے جو حاصل کی جاسکتی ہے۔ تخصص کے ذریعے کوئی اور برتر سند نہیں ملتی۔ دنیائے اسلام کے اندر دیوبند نے خود اپنے میدان میں بلند شہرت قائم کرلی ہے۔

سرکاری امدادوں اور مدرسے کی حکمت عملی :

اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ حکومت کی طرف سے کوئی مستقل امداد یا خاص رقم قبول کر کے اپنی آزادی کا سودا نہ کرے۔ کانپور کی مسجد کے سلسلے میں جس کا ذکر آئندہ آئے گا' سر جیمس اسٹن گورنر صوبہ متحدہ (جہاں دیوبند واقع ہے) کو اس کی حکمت عملی نے مسلمانوں میں غیر مقبول بنادیا تھا۔ اس لئے وہ مضطرب تھا کہ کسی قسم کی تلافی کرے چنانچہ معائنے کی غرض سے اس کے دیوبند آنے کا انتظام کیا گیا اور سر جیمس چاہتا تھا کہ کسی متوالی یا غیر متوالی امداد کا اعلان کرے مگر اس پیش کش کو اس توجیہ کے ساتھ شریفانہ طور پر رد کردیا گیا کہ حکومت سے کوئی مالی امداد لینا اس ادارے کی حکمت عملی کے خلاف ہے جب مہتمم کو گورنر کی دعوت موصول ہوئی اور انہوں نے شمس العلماء کا خطاب قبول کیا تو اس پر بھی ادارے کے اندر اور باہر نکتہ چینی کی گئی۔

مدرسہ دیوبند اور مذہبی نزاعات :

اس درس گاہ کا منصوبہ بنانے والوں کی ابتدائی حکمت عملی یہ بھی تھی کہ اس کے اساتذہ سنی علماء کے دوسرے مکاتب فکر سے فرقہ وارانہ نزاعات میں نہیں الجھیں گے مگر بدقسمتی سے اس کی پابندی نہیں کی گئی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے ساتھ جو اختلافات شروع ہوئے انہوں نے حنفیوں کو مخالف گروہوں میں تقسیم کردیا ہے اور اب ان کے درمیان ذرا سی بھی مودت باقی نہیں ہے۔ (۱)

چونکہ اس مدرسے کو اپنے فرائض برطانوی ہند میں انجام دینے تھے اس لئے حکومت کو اسے بند کرنے کا کوئی بہانہ مہیا کرنا خلاف مصلحت ہوتا۔ اس کے وجود کی حفاظت بڑے اہتمام کے ساتھ کی جاتی تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے اساتذہ اور طلبہ اپنے سیاسی تعلقات کے انتخاب میں آزاد ہوں گے اور سیاسی تحریکات میں عملاً حصہ بھی لیں گے لیکن اگر اس قسم کی سرگرمیاں اس ادارے کے وجود کو کسی خطرے میں ڈالیں گی تو وہ اس سے اپنے رسمی تعلقات منقطع کرلیں گے۔

بالکل یہی صورت اس وقت پیش آئی جب مولانا عبید اللہ سندھی کی سیاسی سرگرمیوں نے ایسا رخ اختیار کیا کہ برطانیہ سے تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ انہیں دیوبند چھوڑنا اور دہلی میں کام کرنا پڑا۔

اس صورت حال پر اس کے مناسب سیاق میں بحث کی جائے گی مگر مذکورہ بالا نکتہ کی وضاحت کے لئے اس واقعے کا ذکر یہاں بھی کرنا پڑا ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر کہ دیوبند کا اثر افغانستان اور قبائلی علاقے میں پھیلایا جائے حنفی مکتب فکر سے مضبوط وابستگی اور نزاع پیدا کرنے سے احتراز کی حکمت عملی بہت معقول تھی مگر بد قسمتی سے اس دار العلوم کی بعض راہ نما ہستیوں نے بھی ایسی آرا کے اظہار کی شدید خواہش کو نہیں دبایا جنہیں خاموشی کے ساتھ بغیر اعتراض وتردید کے نہیں سنا جا سکتا تھا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ایک عظیم المرتبت عالم اور عمیق معارف روحانی سے بہرہ ور صوفی تھے ان کی یاد گہری تعظیم و تکریم کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ وہ علماً کے اس سب سے زیادہ اندرونی حلقے کے ایک رکن تھے جن کی رہ نمائی میں دیوبند کی حکمت عملیاں تشکیل پاتی تھیں۔ انہوں نے یہ فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کے لئے کووں کا گوشت کھانا حلال ہے جو اس زمانے میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے جذبے اور روایت کے خلاف تھا اور اب بھی ہے انہوں نے یہ استدلال بھی کیا کہ خدا کی قدرت میں یہ داخل ہے کہ محمد ﷺ جیسا ایک اور نبی پیدا کر دے انہوں نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ اگر خدا چاہے تو وہ جھوٹ بول سکتا ہے اگر چہ وہ کبھی ایسا نہیں کرتا اور بے شک انہوں نے بزرگان دین کے مزارات پر سالانہ عرس کے اجتماعات اور فاتحہ اور میلاد کے مروجہ مراسم کی مذمت کی اس کا ایک جواب بغیر کسی نام کے دیا گیا جس کا جواب الجواب مولانا خلیل احمد امبیٹھوی نے دیا اس کا ذکر ضرور کرنا چاہیے کہ یہ جواب غیر ضروری طور پر سخت ناپسندیدہ زبان میں پیش کیا گیا۔ دونوں مکاتب فکر کے پیروؤں کے جذبات مشتعل ہوئے اور اس سے قدرتاً تشویش پیدا ہوئی چنانچہ حاجی شاہ امداد اللہ نے ایک مصالحانہ بیان شائع کیا۔ (۲)

اس نزاع نے کم و بیش ویسا ہی افتراق پیدا کیا جیسا سید احمد شہید کے پیروؤں کی بعض آرا نے ایسے مراسم عبادت کی پابندی کے ذریعے پیدا کیا تھا جنہیں قبائلی علاقے کی مقامی آبادی پسند نہیں کرتی تھی۔ (۳) دیوبند کے مکتب فقہ کی مخالفت خاصی عام ہو گئی تھی اور اب بھی موجود ہے۔ اس دوران میں مولانا احمد رضا خان بریلوی کا ظہور دیوبندیوں کے خاص مخالف کی حیثیت سے ہوا۔ (۴) حنفی جو بر عظیم کے مسلمانوں میں زبردست اکثریت رکھتے تھے دیوبندیوں اور بریلویوں کے دو متخاصم گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ان کا یہ نزاع ختم ہونے کے آثار اب بھی نظر نہیں آتے درحقیقت ان دونوں گروہوں کے درمیان اختلافات نے موجودہ صورت حال کو اور زیادہ خراب بنا دیا ہے۔ جاہل عوام کے ذہن میں دیوبندی خیالات وہابیت کی ایک ایسی شکل کے مماثل ہو گئے جو

کسی قدر زیادہ نرم ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس میں تحریک دیوبند کے بانی حنفی مکتبہ فکر کی تعلیمات سے مکمل مطابقت پر اصرار کر کے بچنا چاہتے تھے۔

دار العلوم دیوبند کا قیام :

یہ دار العلوم ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں نمایاں طور پر لڑنے والوں کی ایک خاص تعداد کیلئے جائے پناہ تھا مثلاً مولانا محمد منیر نانوتوی، جو مشہور مولانا مملوک علی، مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا عبد الغنی کے شاگرد تھے اور ان لوگوں میں نمایاں تھے جو انگریزوں کے خلاف بڑی جرأت کے ساتھ لڑے۔ کئی سال تک اس ادارے کے مہتمم رہے اس قسم کے تقررات اس ادارے کی حکمت عملی کے مطابق تھے کیونکہ انگریزوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں انتہائی احتیاط برتنے کے باوجود، تاکہ انہیں کاروائی کرنے کی کوئی وجہ نہ مل سکے خاص مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو بالکل مطمئن اور اپنی غلامی پر راضی برضا نہ ہونے دیا جائے۔

دار العلوم کے برادر ادارے :

ایسے برادر اداروں کے قیام کی ہمت افزائی کی جاتی تھی جو اسی قسم کے اعلیٰ مقاصد کے تحت جاری کئے جائیں پہلے دو مدرسے سہارنپور اور مراد آباد میں قائم کئے گئے بعد میں ایسے اداروں کی تعداد تقریباً چالیس ہو گئی باضابطہ الحاق کا کوئی نظام نہیں تھا مگر اساتذہ زیادہ تر ایک ہی مکتب فکر کے لوگ ہوتے تھے بعد میں تقرر کیلئے دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ اور بعض اوقات اساتذہ کی سفارش کی جاتی تھی۔

مظاہر العلوم سہارنپور :

سہارنپور کا مدرسہ مولانا سعادت علی سہارنپوری کے زیر نگرانی قائم کیا گیا تین مہینے بعد ۱۸۶۶ء میں مولانا محمد مظہر نانوتوی استاد حدیث اور صدر مدرس مقرر کئے گئے۔ وہ بھی مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے اور انہوں نے حدیث کا درس مولانا محمد اسحاق کے قدموں میں لیا تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں لڑے تھے اور سقوط شاملی کے بعد پوشیدہ ہو گئے تھے۔ مدرسہ کو ان کی نگرانی میں فروغ حاصل ہوا۔ وہ بہت جلد ایک اچھی عمارت تعمیر کرنے کے قابل ہو گیا اور اس میں منتقل ہونے کے بعد اس کا نام "مظاہر العلوم" رکھا گیا اور اس نے اسلامی علوم و فنون کے ایک مرکز کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

ان اداروں کی خصوصیات :

ان اداروں کو اسلام کی بہترین علمی روایات کے مطابق چلایا جاتا تھا وہ اساتذہ اور طلبہ کی ایسی بستیاں تھیں جن کا انتظام خود ارکان مجلس علمی کرتے تھے اساتذہ ان قدرے قلیل وظائف پر قناعت کرتے تھے جو انہیں بطور تنخواہ وصول ہوتے تھے۔ اور ادارے کو ایسی مالی امدادیں قبول کرنے پر جو کسی کی طرف سے کوئی پابندی

عائد کرتی ہوں مجبور کر کے اپنی آزادی کا سودا نہیں کرتے تھے۔ کسی معطی کو مدرسے کے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی اساتذہ کی ہر نسل مختلف میدانوں میں بلند مرتبت علماً پیدا کرتی تھی جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے ان اداروں نے محض کتابی کیڑا پیدا نہیں کئے ان کے اساتذہ اور طلبہ اپنے اردگرد کی دنیا سے دلچسپی لیتے تھے اور جب کبھی انہیں افق پر کوئی خطرہ نظر آتا تھا تو وہ اس کے مقابلے کی تیاریاں کرتے تھے۔

ایک تنقیدی نظر :

مگر اپنی قدامت پسندی سے بدگمانی کی بنا پر وہ مسلم عوام کے لئے قیادت مہیا کرنے کے اولین مقصد میں ناکام ہو گئے اور مسلم عوام' اس احترام کے باوجود جو علماً کے لئے ان کے دلوں میں تھا' اپنی قسمت آئندہ کے لئے ان کے سپرد نہیں کر سکتے تھے لیکن اس صورت حال کو محسوس کرنے میں خاصہ عرصہ لگا۔

ریشمی رومال تحریک اور اس کا پس منظر :

۷۸۔۱۸۷۶ء کی روس ترکی جنگ کے بعد مسلم دنیا میں یہ احساس کہ اسلامی آزادی برابر سکڑ رہی ہے تقریباً عام ہو گیا اس عمل کو کس طرح روکا جا سکتا تھا؟ اگر مسلم ممالک اپنے آپ کو مسلح کرتے اور انہوں نے اپنے جنگی ساز و سامان اور افواج کو نئے طرز پر لانے کا کام پہلے ہی شروع کر رکھا تھا..... تو کیا وہ اس دوڑ میں مغرب کو پکڑ لیتے؟ وہ ایسا کر سکتے تھے' جیسا کہ جاپان نے کر دکھایا مگر پھر یہ بھی تو ہے کہ جاپان اس طرح مسلسل دباؤ میں نہیں رہا تھا جیسا کہ مسلم دنیا رہی تھی۔ براعظم میں سلطنت مغلیہ کے خاتمے نے برطانیہ عظمیٰ کو ایشیا کے مرکز میں بٹھا دیا تھا۔ مسلم دنیا کا مغربی حصہ گھر گیا تھا شمالی افریقہ اور ایشائے کوچک میں یورپ توسیع کی ایک طویل روایت کے ساتھ مجبور تھا اور اسے صرف اسی وقت آگے بڑھنے سے روکا جا سکا تھا جب مسلمان طاقت ور تھے جنوبی اور وسطی افریقہ نے یوروپی نوآبادکاری کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا چونکہ بحر ہند میں مسلمانوں کی بالادستی ختم ہو چکی تھی اس لئے مسلم دنیا کا مشرقی حصے پر جو جزیرہ نمائے ملایا سے لے کر فلپائن اور شرق الہندی مجمع الجزائر کے انتہائی کناروں تک تھا' قبضہ ہو گیا تھا اب یورپ کی تقریباً مجموعی طاقت اس پر تلی ہوئی تھی کہ عثمانیوں کو یکے بعد دیگرے مسلسل حملوں سے جانبر ہونے کا کوئی موقع نہ دے"

اسی زمانے میں جب ۷۸۔۱۸۷۶ء کی روس ترکی جنگ ہو رہی تھی بعض تخیل پسند مسلمانوں نے جو نہ جغرافیہ سے پوری واقفیت رکھتے تھے اور نہ انہیں بین الاقوامی صورت حال کے حقائق کا علم تھا سلطان کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ سوڈان کے مہدی اور ایران سے اتحاد کر کے ہندوستان پر حملہ کر دے۔ سلطان نے اس قسم کی غیر ممکن العمل تجویز پر کوئی توجہ نہیں کی مگر اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کی کچھ حمایت حاصل کرنی چاہیے۔ براعظم کے مسلمانوں نے ان سپاہیوں کے خاندانوں کی امداد کے لئے جو شہید یا

معذور ہو گئے تھے چندہ جمع کیا وہ جنگ یونان و ترکی کے واقعات کو بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ جب ۱۸۹۷ء میں ترکوں نے تھیسلی میں یونانیوں کو شکست فاش دی تو بمبئی اور شملہ کے جیسے طویل فاصلوں پر واقع شہروں میں جشن منائے گئے ایک مسلم وفد ترکی قونصل جنرل سے ملا اور اس سے درخواست کی کہ وہ براعظم کے مسلمانوں کی طرف سے خلیفہ کو ہدیہ تہنیت پہنچا دے۔ خطبہ جمعہ میں سلطان ترکی کے نام کا ذکر اس کے خطابات کے ساتھ کرنے کا رواج اسی وقت پڑا۔ ایسی حالت میں کہ عیسائی طاقتیں اس کی عیسائی رعایا کی وفاداری کو تباہ کر رہی تھیں کیا وہ بھی عیسائی طاقتوں کی مسلم رعایا کی حمایت حاصل کرنے کے لئے کوشش کر سکتا تھا؟ وہ خلیفہ تھا اور اس حیثیت سے تمام مسلمانوں کے لئے خواہ وہ کہیں رہتے ہوں امیر المومنین تھا اس لئے اس نے بطور خلیفہ کے اپنی حیثیت پر زور دینا شروع کیا۔ اور چونکہ اس کی کوشش اس اعتبار سے بار آور ہو رہی تھیں کہ اس کی حیثیت اس کی سلطنت سے باہر' بالخصوص ان علاقوں میں جہاں مسلمان آزاد نہیں تھے تسلیم کی جا رہی تھی اس لئے اس کی ہمت افزائی ہوئی وہ ہر سال حج کے دوران بڑے اجتماعات کے ذریعے دنیا کی مسلم آبادی کے نہایت دین داری طبقوں تک رسائی رکھتا تھا۔ یہ بات چاروں طرف پھیل گئی کہ مسلمانوں پر خلیفہ کی اطاعت واجب ہے قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ سلطان کو یہ خیال بہم پہنچانے میں (ایک حد تک) انگریزوں کا بھی ہاتھ تھا۔ انہوں نے پھر سلطان کو ترغیب دی تھی کہ وہ ٹیپو سلطان کو ایک خط لکھے اور اس میں انگریزوں سے وفاداری کی طرف اشارہ کرے انہوں نے پھر دوبارہ اسے یہ ترغیب دی تھی باج گزار مسلم والیان ریاست کو یہ لکھے کہ وہ ۱۸۵۷ء میں باغیوں کا ساتھ نہ دیں۔ اگر سلطان کا اثر کسی بغاوت میں شرکت سے مسلمانوں کو روک سکتا تھا تو کیا وہ بغاوت برپا نہیں کرا سکتا تھا؟

اسلئے جب یہ واضح ہو گیا کہ ترکی کو پہلی عالمی جنگ میں شریک ہونا پڑے گا تو سلطان نے اپنی کوششیں تیز کر دیں چونکہ براعظم کے مسلمانوں نے ان جنگوں کے دوران جو ۱۳۔ ۱۹۱۱ء کے زمانے میں ہوئی تھیں ترکوں کے لئے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تھا اس لئے ان کی طرف مخصوص کوششیں منعطف کی گئیں۔ متعدد ترک مختلف بہانوں سے براعظم آئے۔ کمال عمر بے اور عدنان بے کو جنگ بلقان کے دوران مدد کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ترکی انجمن ہلال احمر کی طرف سے بھیجا گیا۔ وہ بمبئی' دہلی' لاہور' پٹنہ اور کلکتہ گئے اور سربرآوردہ مسلمانوں سے روابط قائم کئے تھوڑے عرصے کے بعد قسطنطنیہ کے ایک اخبار کے ایڈیٹر ایس۔ ایم۔ توفیق بھی ان میں شامل ہو گئے۔ براعظم کے حامیان اتحاد اسلامی کے ساتھ ان کا رابطہ رہا تھا ان کے بعد ترکی فوج کے محمد سمیع بے اور لیفٹننٹ مصطفیٰ صادق آئے جو کراچی میں جہاز سے اترے اور اتحاد اسلامی کے حامیوں سے تعلقات استوار کرنے کے لئے بمبئی' دہلی اور لاہور گئے پھر تین ترک اور دو ان کے ملازم کاشغر جانے کے ارادے سے

بمبئی میں اترے انہیں ایشیائے وسطی کے مسلمانوں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ اتحاد اسلامی اور اتحاد تورانی کے جذبات کی بنیاد پر حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہندوستانی محکمہ خبر رسانی نے یہ دریافت کیا کہ محمد سمیع بے حقیقتاً حاجی سمیع بے تھے اور مجلس اتحاد و ترقی کی طرف سے بھیجے گئے تھے جو نوجوان ترکوں کی سیاسی تنظیم تھی۔ سمیع بے کا بھائی اشرف بے ترکوں کے لئے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے مصر بھی گیا تھا اور وہاں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ایک ہندوستانی مسلمان قسطنطنیہ سے ایک ہفتہ وار اخبار "جہان اسلام" نکالتا تھا جس میں ترکی، عربی اور اردو کے مضامین شائع ہوتے تھے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایشیائے وسطی، عربی بولنے والے ممالک اور برا عظم کی رائے عامہ کو متاثر کرے۔ وہ برا عظم کے مسلم اخبارات کے ایڈیٹروں اور اتحاد اسلامی کے حامیوں کے پاس برابر آتا تھا انہیں کمال عمر بے اور عدنان بے کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ بھی موصول ہوا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ترکی جرمنی کے اتحادی کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہو جائے گا۔ ترکی نے حصول حمایت کے لئے اپنی کوششیں افغانستان میں بھی جاری کر دیں ان علاقوں سے راست روابط کے علاوہ حج سے واپس آنے والے حاجی بھی اپنے ساتھ ایسے دستی اشتہارات لاتے تھے جن میں ترکی کے لئے امداد و حمایت کی درخواست کی جاتی تھی۔ اس کے جواب میں کابل کے سراج الاخبار نے ترکی کے لئے گہری ہمدردی کا اظہار کیا اور اس پر بھی زور دیا کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔ برعظیم میں اس اشاعت کے نسخے بڑی تعداد ان میں موصول ہوئے اور شوق سے پڑھے گئے۔ مولانا محمد علی نے اپنا مشہور مضمون "ترکوں کا انتخاب" اپنے ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" میں لکھا جس کا نتیجہ بعد میں یہ ہوا کہ انہیں نظر بند کر دیا گیا اور ان کا پریس ضبط کر لیا گیا۔

آخر کار برعظیم میں یہ خبر پہنچی کہ سلطان نے اعلان جنگ کر دیا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ یہ جنگ جہاد ہے انجمن خدام کعبہ کے دو ارکان کی قیادت میں سات سو حاجیوں کی ایک جماعت ترکوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہونے کے لئے حجاز ہی میں رہ گئی۔ مشہور مصری حامی اتحاد عبدالعزیز شاویش کو مجلس اتحاد و ترقی نے اتحادیوں کے خلاف کام کرنے کے لئے مقرر کیا ان کا رابطہ مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان اور کلکتہ کے امام الدین سے قائم تھا۔ چند سر برآوردہ مسلمانوں کا ایک جلسہ بڑی رازداری کے ساتھ دفتر "ہمدرد دہلی" میں اس لئے منعقد ہوا کہ جہاد کے امکانات پر بحث کی جائے۔ اب حکومت نے کاروائی کی۔ مولانا ظفر علی خان کو ترکوں کی حمایت میں ایک تقریر کرنے پر نظر بند کیا گیا۔ مولانا محمد علی اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی نظر بند کر دیئے گئے اور "کامریڈ" اور "ہمدرد" ضبط کر لئے گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی نظر بند کئے گئے اور "الہلال" کی اشاعت بند ہو گئی۔

لاہور کے مہاجر طلبہ :

سلطان نے خلیفہ کی حیثیت سے جو فتوائے جہاد جاری کیا تھا اس کے نسخے سرحد کے لشکر مجاہدین میں موصول ہوئے تھے ۔ اس تنظیم کے نمائندے مولوی فضل الٰہی تھے اور ان کے گماشتے لاہور میں مولوی عبدالرحیم تھے جو عام طور پر مولوی بشیر کے نام سے مشہور ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پرجوش مسلم طلبہ کا ایک گروہ تھا جنہیں مولوی عبدالرحیم نے یہ ترغیب دی کہ وہ ترکی فوج میں شریک ہو کر جہاد میں حصہ لیں۔ گورنمنٹ کالج کے آٹھ طلبہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے چار طلبہ اور ایچیسن چیفس کالج اور اسلامیہ کالج کے ایک ایک طالب علم نے رازداری کا حلف اٹھایا اور ۵ فروری ۱۹۱۵ء کو معتدبہ تکالیف کے بعد مرکز میں پہنچے اور وہاں سے کابل آگئے۔ کوہاٹ اور پشاور کے چند طلبہ بھی ان سے جا ملے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن :

یہ نوجوان ہی وہ مسلمان نہیں تھے جن کا ذہن اس سمت میں کام کر رہا تھا دارالعلوم دیوبند کے ایک استاد مولانا محمود حسن بھی جو بعد میں شیخ الہند کے لقب سے مشہور ہوئے ترکوں کی مدد کرنے کے لئے برعظیم میں ایک بغاوت منظم کرنے کے امکانات پر غور کر رہے تھے ان کے ایک شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی اس کام کے لئے نہایت موزوں شخصیت رکھتے تھے۔ وہ ایک پیدائشی انقلابی تھے۔ ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور ابھی طفلِ مکتب ہی تھے کہ مسلمان ہو گئے تھے استاد اور شاگرد نے ایک دوسرے پر بڑا گہرے اثر ڈالے۔ مولانا عبیداللہ کا منصوبہ یہ تھا کہ جہاد کے عقیدے کو دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ کے ذریعے تمام برعظیم میں پھیلایا جائے۔ دارالعلوم کی انتظامیہ کو یہ فکر تھی کہ حکومت کو کوئی ایسا بہانہ فراہم نہ کیا جائے کہ وہ اس ادارے کو تباہ کر دے اس لئے اس نے انہیں استاد کے عہدے سے سبکدوش کر دیا۔

نظارۃ المعارف القرآنیہ :

مولانا عبیداللہ بغیر کسی خوف وخطر کے 'دہلی چلے گئے وہاں انہوں نے حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک کی مدد سے "نظارت المعارف القرآنیہ" کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ جو مسلم نوجوان برطانوی ہندی لادینی تعلیم کے زیر اثر آرہے ہیں ان میں تعلیمات اسلامی کو مقبول بنایا جائے۔ یہاں بھی انہوں نے دو مختصر رسالے لکھے جن میں اتحاد عالم اسلامی کی اہمیت پر زور دیا۔ ان رسائل میں انہوں نے اس منصوبے کی حمایت بھی کی کہ برعظیم پر باہر سے ایک حملہ ہونا چاہیے اور اس کے بعد ہی انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت اندرون ملک برپا ہونی چاہیے۔

استاد شاگرد کے بیرون ہند کے سفر :

وہ مولانا محمود حسن کے پورے تعاون سے کام کر رہے تھے' جنہوں نے اب یہ سوچا کہ بہترین کام کسی

مسلم ملک ہی میں جا کر ہو سکتا ہے اور اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ حجاز جائیں گے اور مولانا عبید اللہ سندھی سے کہا کہ وہ افغانستان جائیں جو جرمن، ترکی اور ہندوستانی باغیانہ سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ مولانا محمود حسن ہندوستان سے عین وقت پر روانہ ہو گئے کیونکہ حکومت ہند انہیں گرفتار کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ مگر یہ خبر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو بعض ہمدردوں کے ذریعے مل گئی تھی اور انہوں نے مولانا کے سفر کا انتظام کر دیا تھا۔ مولانا محمود حسن اپنی روانگی سے قبل انگریزوں کے خلاف خفیہ کام کر رہے تھے۔ ہندو اور سکھ انقلابیوں سے ان کا رابطہ قائم تھا اور وہ اکثر خفیہ طور پر ان سے ملنے دیوبند آیا کرتے تھے، جہاں انہوں نے ایک مکان خاص طور پر ان کے ٹھہرنے کے لئے کرایہ پر لے رکھا تھا۔

قبائلی علاقے میں جہادی سرگرمیاں :

اس کے علاوہ انہوں نے سرحد پر لشکر مجاہدین کو سرگرم عمل کرنے کی بھی کوششیں کیں اور اپنے معتمد ایلچی اس علاقے میں بھیجے تاکہ قبائل میں اتحاد پیدا کریں۔ اور مجاہدین کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور کریں۔ اس مقصد میں انہیں متعدبہ درجے تک کامیابی حاصل ہوئی کیونکہ ان کے بہت سے شاگرد اس علاقے میں تھے جن پر مقامی آبادی کا اعتماد قائم تھا حاجی ترنگ زئی کو بھی اس پر آمادہ کیا گیا کہ وہ برطانوی علاقہ چھوڑ کر قبائلی علاقے میں منتقل ہو جائیں۔ ابتداً میں قبائل اور مجاہدین کو کامیابی ہوئی مگر بعد میں انہیں مشکلات درپیش آئیں جن کی ایک وجہ تو اسلحہ کی کمی تھی اور دوسری وجہ انگریزوں کا یہ پروپیگنڈہ تھا کہ سرحدی علاقے کو قریب ترین مسلم فرمانروا امیر افغانستان کی رہنمائی کا انتظام کرنا چاہیے۔ (اور جہاد سے پہلے جہاد کی بیعت ضروری ہے) یہ چال کام کر گئی، کیونکہ انگریز جانتے تھے کہ امیر حبیب اللہ خان انگریزوں سے نہیں لڑیں گے۔ یہی وہ واقعات تھے جن کے پیش نظر مولانا محمد حسن نے مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیجنے کا فیصلہ کیا، اور اگر یہ خبر نہ آتی کہ انگریزوں کا ارادہ انہیں گرفتار کرنے کا ہے تو بھی وہ حجاز روانہ ہو جاتے اس خبر نے ان کی روانگی میں صرف تعجیل کر دی۔ وہ اس معاملے میں خوش قسمت تھے کہ صوبائی حکومت کے نام احکام بذریعہ تار اس وقت بمبئی پہنچے تھے جب جہاز بندرگاہ سے روانہ ہو گیا تھا اور یہی صورت عدن میں پیش آئی۔

کابل میں انقلابی سرگرمیاں :

مولانا عبید اللہ سندھی پہلے سندھ گئے اور وہاں سے بلوچستان سے ہوتے ہوئے مقامی لوگوں کی مدد سے قندھار پہنچے۔ پھر انہیں کابل بھیجا گیا جہاں خفیہ طور پر ان کی باریابی امیر حبیب اللہ خان کی خدمت میں ہوئی مولانا عبید اللہ سندھی نے انقلابی ہندوستانی جماعت سے رابطہ پیدا کیا۔ جنگ کے آغاز پر بہت سے ہندوستانی برلن گئے تھے جہاں انہوں نے ہر دیال کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف سرگرمیاں منظم کیں۔ برلن کے اس گروہ نے

سوچا کہ افغانستان میں اس کی بھی نمائندگی ہونی چاہیے تاکہ وہ ہندوستان سے روابط قائم کر سکے۔ کابل میں اس گروہ کے رہنما راجہ مہندر پرتاب اور مولوی برکت اللہ (بھوپالی) تھے موخر الذکر ہندوستانی غدر پارٹی کے ارکان تھے' جسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں رہنے والے متعدد ہندوستانیوں نے منظم کیا تھا۔ وہ ٹوکیو میں اردو کے پروفیسر رہ چکے تھے اور ایک متشدد مخالف برطانیہ جریدے کے ایڈیٹر تھے انہیں جاپانی حکام نے برخاست کر دیا اور ان کا اخبار (اسلامی فریٹرنیٹی جو انگریزی جاپانی اور اردو تین زبانوں میں بیک وقت شائع ہوتا تھا) بند کر دیا گیا۔ وہ ٹوکیو سے برلن گئے تھے اور وہاں سے انہیں کابل بھیجا گیا تھا اسی طرح راجہ مہندر پرتاب جینیوا گئے تھے جہاں وہ ہر دیال سے ملے تھے اس کے بعد وہ برلن گئے جہاں سے انہیں کابل روانہ کر دیا گیا جرمن مشن اپنے ہندوستانی مشیر کے متعلق جس وہم کا شکار تھا اس کا ازالہ بہت جلد ہو گیا کیونکہ ہندوستانیوں نے برعظیم کے اندر بغاوت برپا کرنے میں کامیابی کی بڑی امیدیں دلائی تھیں مگر انہوں نے دیکھا کہ نہ امیر افغانستان کے جنگ میں شریک ہونے کا امکان تھا اور نہ ہندوستان میں ہندوستانی کچھ کر سکتے تھے۔

ہندوستانی جماعت کے متعلق مولانا عبید اللہ سندھی کی فریفتگی بھی دور ہو گئی ان کی رائے یہ تھی کہ راجا مہندر پرتاب ایک ہندو فرقہ پرست ہے اور پنڈت مدن موہن مالویہ سے اس کا ساز باز ہے جنہیں وہ افغانستان میں ترکی جرمن جدو جہد کے تمام راز بھیج دیتا ہے۔ انہوں نے یہی رائے پنجابی آریہ سماجی رہنما لالہ لالجپت رائے کے متعلق قائم کی۔ ان کی رائے برلن گروہ کے متعلق بھی یہ تھی کہ وہ ہندوستانی قوم پرستی کے پردے میں ہندو فرقہ پرستوں کی ایک جماعت ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ برعظیم پر کسی ترکی جرمن حملے کو ٹلائے اور اگر ایسا حملہ ناگریز ہو جائے اور امیر افغانستان کی مدد سے کامیاب ہوتا معلوم ہو تو ہندو مفادات کے تحفظ کے لئے اس میں نیپال کے بھی اسی طرح شامل ہونے کا بندوبست کیا جائے۔ برکت اللہ کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکے۔ درحقیقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں صرف اس لئے شامل کر لیا گیا تھا کہ ایک ہندو تنظیم کو پوری طرح ہندوستانی تنظیم کے رنگ میں پیش کیا جائے۔

مولانا محمد میاں کی سرگرمیاں :

مولانا عبید اللہ سندھی کے ساتھ مولانا محمد میاں انصاری بھی جا ملے۔ جو دیوبند میں ان کے رفیق کار رہ چکے تھے انہوں نے مولانا محمود حسن کے ساتھ حجاز تک سفر کیا تھا اور وہاں سے انہیں ترکی جنرل غالب پاشا کی طرف سے ایک دعوت جہاد کے ساتھ ہندوستان واپس بھیجا گیا تھا مولانا محمد میاں انصاری نے اس دعوت جہاد کے نسخے اپنے سفر کے دوران مختلف مقامات پر اور ہندوستان میں تقسیم کئے جو لوگ شریک راز تھے وہ اس دستاویز کو "غالب نامہ" کہتے تھے حکومت ہند کی سخت نگرانی کے باعث صرف چند نسخے تقسیم کئے جا سکے مولانا

ثمد میاں انصاری کو گرفتار کرنے کے احکام جاری ہو چکے تھے' مگر وہ قبائلی علاقے کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہو گئے جہاں انہوں نے کچھ عرصے لشکر مجاہدین میں قیام کیا اور اس کے بعد کابل چلے گئے۔

کابل کی عارضی حکومت ہند اور اس کے مشن :

کابل میں جو عارضی حکومت قائم کی گئی تھی اس کے صدر راجا مہندر پرتاب اور وزیر اعظم برکت اللہ تھے جب اس میں مولانا عبید اللہ کو شامل کیا گیا تو انہیں وزیر داخلہ مقرر کیا گیا۔ جرمن مشن ۱۹۱۶ء کے آغاز میں واپس چلا گیا۔ عارضی حکومت نے ایک مشن روس بھیجا اور زار سے یہ درخواست کی کہ وہ برطانیہ عظمی سے اپنے اتحاد کو ختم کر دے اور ہندوستان پر حملہ کرے یہ خط ایک طلائی تختی پر کندہ کیا گیا تھا۔ ترکی اور جاپان کو بھی مقصدی وفود بھیجے گئے۔ مولانا عبید اللہ نے ان وفود میں اپنے اعتماد کے نوجوانوں کو شامل کرنے پر اصرار کیا تاکہ اس کا اطمینان حاصل ہو سکے کہ مسلم نقطہ نگاہ کی نمائندگی ضرور ہو گی اور مذاکرات کے دوران جو کچھ ظاہر ہو گا وہ ضرور ان کے علم میں آئے گا۔

ریشمی خطوط اور جنودِ ربانیہ کا قیام :

مولانا محمد میاں انصاری نے ایک خط مولانا محمود حسن کو لکھا جس میں تمام پیش آمدہ واقعات و حالات کی تفصیلات تھیں اور "حزب اللہ" (۵) کے نام سے ایک ایسی فوج تنظیم کے متعلق تجاویز بھی تھیں جس کا مرکز مدینہ میں اور مقامی مراکز قسطنطنیہ' تہران اور کابل میں رکھنے کا منصوبہ تھا۔ یہ ساری تنظیم مولانا محمود حسن کے ماتحت تھی کابل کا مرکز مولانا عبید اللہ سندھی کے ماتحت ہونا تھا۔ ایک اور خط بھی مولانا محمد میاں انصاری کی طرف سے شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی (سندھ) کے نام تھا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ مولانا محمود حسن کے نام کا خط کسی معتمد حاجی کے ذریعے ان کے پاس بھجوا دیں اور اگر کوئی کافی معتمد شخص دستیاب نہ ہو تو اسے خود لے جائیں یہ خطوط زرد ریشمی کپڑے پر بالکل صاف لکھے ہوئے تھے اسی لئے انہیں "ریشمی خطوط" کہا جانے لگا۔ یہ ریشمی کپڑا پیغامبر کی صدری اور اس کے استر کے درمیان سی دیا گیا تھا اور اسے بڑی احتیاط کے ساتھ ہدایات دے دی گئی تھیں۔

افشائے راز :

اس کا ظاہری مقصد سفر یہ تھا کہ جو طلبہ افغانستان گئے ہوئے تھے ان میں سے ایک طالبعلم کے باپ کو اس کے بیٹے کی خیریت سے مطلع کر دے۔ وہ باپ سر مائیکل اوڈوائیر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کا دوست تھا۔ اس نے راز سربستہ کا سراغ لگا لیا اور ان خطوط پر قبضہ کر کے انہیں (بہ واسطہ کمشنر ملتان ڈویژن) سر مائیکل کے حوالے کر دیا اس پر متعدد گرفتاریاں کی گئیں۔ حکومت ہند نے افغانستان سے احتجاج کیا اور مولانا عبید اللہ سندھی اور ان

کے دوستوں کو نظر بند کر دیا گیا۔ مولانا محمد میاں انصاری پہلے ہی مجاہدین کے مرکز چلے گئے تھے۔ ریشمی خطوط کے لکھنے والے بین الاقوامی صورت حال سے پوری طرح واقف نہیں تھے کیونکہ اس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی شریف مکہ ترکوں کے خلاف بغاوت کر چکا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے رفقا کو جلال آباد منتقل کر دیا گیا۔ امیر حبیب اللہ خان قتل کر دیئے گئے اور امان اللہ خان ان کے جانشین ہوئے وہ برطانیہ کے اس قدر زیادہ حامی نہیں تھے اور انہوں نے عبید اللہ سندھی کو کابل طلب کر لیا۔ انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ انگریز افغان جنگ میں تھل کے مقام پر لاہور کے ایک طالب علم ظفر حسن نے قابل تعریف خدمات انجام دیں۔ ایک اور ہندوستانی طالب علم اللہ نواز نے بچہ سقہ کی بغاوت کے دوران کے موجودہ شاہی خاندان کی اچھی خدمت کی۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں مولانا عبید اللہ سندھی سرحد پار کر کے سوویت یونین چلے گئے۔

حجاز میں مولانا محمود حسن کی سرگرمیاں :

اب ہم حجاز میں مولانا محمود حسن کی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہاں انہوں نے ترکی گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی درخواست کی۔ ان کے گزشتہ حالات کے متعلق تحقیقات کرنے کے بعد غالب پاشا نے انہیں رازدار بنا لیا اور یہ مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں کام کریں مگر مولانا نے بتایا کہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ غالب پاشا نے اس پر اصرار کیا کہ ہندوستان کے مسلمان بذات خود کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکیں گے اس لئے انہیں ہندوؤں سے تعاون کرنا چاہیے بالکل یہی وہ مشورہ تھا جو افغان ہمدردوں (حبیب اللہ خان) نے مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے رفقا کو دیا تھا۔ یہ مشورہ برعظیم کی مسلم قیادت تک پہنچا دیا گیا اور تحریک خلافت کے دوران مسلمانوں پر اور دیوبندی مکتب فکر کے علماء کی اکثریت پر ان کے بعد کی پوری سیاسی فکر میں اس کا زبردست اثر رونما ہوا۔ مولانا محمود حسن قسطنطنیہ جا کر انور پاشا سے ملنا بھی چاہتے تھے۔ جس کے لئے انتظامات کر دیئے گئے تھے مگر انور پاشا اور جمال پاشا خود مدینہ آئے اور مولانا محمود حسن کو ان سے خفیہ ملاقات کرنے اور اپنے منصوبوں پر بحث کرنے کا موقع مل سکا۔ انہوں نے ہندوستانیوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ کسی طاقت کا انتداب یا سرپرستی کسی شکل میں قبول کر کے اپنی مکمل آزادی کے سوال پر کوئی سمجھوتا نہ کریں۔ وہ پرامید تھے کہ مستقبل قریب میں ایک امن کانفرنس بلائی جائے گی جس میں ترکی اور اس کے اتحادی ہندوستان کی آزادی کا سوال اٹھائیں گے۔ مولانا محمود حسن نے درخواست کی کہ انہیں برعظیم کی سرحد پر لشکر مجاہدین میں پہنچانے کے انتظامات کر دیئے جائیں مگر انہیں بتایا گیا کہ چونکہ ایران کے بعض حصوں پر اتحادیوں کا قبضہ ہے اس لئے اس ملک میں سے راہداری کا انتظام ممکن نہیں ہے۔

انہوں نے مولانا محمود حسن سے وعدہ کیا کہ وہ ایک خط عربی اور فارسی میں انہیں بھیجیں گے جسے مقصد

تی تکمیل کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ خطوط موعود بہت جلد شام سے موصول ہو گئے جہاں وہ دونوں ترکی وزیر انور پاشا اور جمال پاشا مدینے سے گئے تھے۔ یہ خط ایک صندوق کی تہ میں ایک خلا کے اندر بڑی احتیاط سے چھپائے گئے تھے اور اس کے اوپر کچھ کپڑے ترتیب سے رکھ دیئے گئے تھے۔ یہ صندوق مولانا محمود حسن کے بعض معتمد اشخاص کے ساتھ ہندوستان بھیج دیا گیا اور انہیں یہ ہدایت کی گئی کہ یہ خطوط ضلع مظفر نگر میں حاجی نور الحسن کے حوالے کئے جائیں جو دھلی کے فوٹوگرافر احمد مرزا سے ان کے فوٹوگراف نکلوا کر انہیں ان اشخاص میں تقسیم کرائیں گے جن کے نام ظاہر کئے گئے ہیں۔ یہ پورا مشن کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ اگرچہ ہندوستانی پولیس کو صحیح اطلاع کئی مرتبہ ملی مگر پوری طرح تحقیقات کرانے کے باوجود ان خطوں پر قبضہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔

شریف مکہ کی بغاوت :

یہ حکایت ایک دلچسپ جاسوسی افسانہ معلوم ہوتی ہے (لیکن حقیقت تھی) اگرچہ اس تمام مہم کا خالص نتیجہ محض صفر تھا کیونکہ جنگ نے دول وسطی کے خلاف رخ اختیار کر لیا اور یہ امر یقینی ہو گیا کہ ان کی شکست ناگزیر ہے مولانا محمود حسن اپنے آئندہ لائحہ عمل پر گفتگو کرنے کی غرض سے غالب پاشا کی ملاقات کے لئے مدینہ سے طائف گئے وہ ابھی وہیں تھے کہ شریف مکہ نے ترکی کے خلاف بغاوت کر دی اور طائف مدینہ سے منقطع ہو گیا۔

شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی گرفتاری :

چھ ہفتوں کے بعد مواصلات بحال ہوئے اور مولانا طائف سے مکہ آ سکے یہاں شریف کے ایک عامل نے ان سے ایک بیان پر دستخط کرنے کے لئے کہا جس میں ترکی کے خلاف اس کی بغاوت کو جائز قرار دیا گیا تھا ان کے انکار پر وہ اور ان کے رفقاء گرفتار کر لئے گئے اور انہیں جدہ بھیج دیا گیا اور وہاں سے قاہرہ پہنچایا گیا تھا جہاں ایک برطانوی عہدہ دار نے جو ہندوستان سے اسی خدمت کے لئے مامور تھا ان پر سخت جرح کی اس کے بعد انہیں مالٹا لے جایا گیا اور وہاں جنگی قیدی کی حیثیت سے (تقریباً تین برس تک) رکھا گیا۔

افغانستان اور حجاز میں جو واقعات پیش آئے ان سے عوام کو اس وقت تک کوئی واقفیت نہیں ہوئی جب تک کہ ۱۹۱۸ء میں "سڈیشن کمیٹی" کی روداد شائع نہیں ہوئی۔ اس وقت تک جو کچھ وقتاً فوقتاً حکومت کے علم میں آتا رہا اسے بھی اخبارات میں جانے کی راہ نہیں ملی کیونکہ اسے شائع کرنا خلاف مصلحت ہوتا۔

رازداروں کی کمزوری :

ان مشکل مہمات پر جن لوگوں کو لگایا گیا تھا انہوں نے حیثیت مجموعی رازوں کی پردہ داری اچھی طرح

کی صرف دو مسئلیات تھے۔ ایک وہ آدمی (عبدالحق) جسے ریشمی خطوط کی ترسیل کا کام سپرد کیا گیا تھا اور دوسرا (محمد مسعود) مولانا محمود حسن کا ایک رشتہ دار (بھانجا)۔ موخر الذکر کو ڈاکٹر انصاری نے اس لئے عرب بھیجا تھا کہ ایک ہزار روپیہ مولانا کو دیئے تھے اور ان کے متعلق حکومت ہند کے عام رویہ کا جو پتا چلا تھا اس سے انہیں مطلع کرنا تھا۔ مولانا محمود حسن نے اس شخص کو انور پاشا اور جمال پاشا کے خط کے متعلق تفصیلات بتا کر راز دار بنالیا کیونکہ وہ لوگ جو اس صندوق کو لے گئے بمبئی پر جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر لئے گئے مولانا یہ چاہتے تھے کہ ان اشخاص تک پیغام پہنچ جائے جنہیں اس خط کی نقول متعدد لوگوں میں تقسیم کرنے کے لئے مختلف اقدامات کرنے تھے یہ رشتہ دار پولیس کے ایک تجربہ کار عہدہ دار کی جرح میں اپنی ناتجربہ کاری کے باعث بول گیا اور سب کچھ اگل دیا۔

علمائے دیوبند کا غیر معمولی کارنامہ :

دو علمائے دین کے لئے جنہوں نے تعلیم گاہوں کی خانقاہی عزلت میں پرورش پائی ہو اور جو نہ صرف خفیہ تنظیموں کا بلکہ حسب معمول سیاسی سرگرمیوں کا بھی کوئی سابقہ تجربہ نہ رکھتے ہوں کسی بین الاقوامی نوعیت کی سازش میں جوڑ توڑ کرنا اور ایک وسیع پیمانے پر خفیہ کام کی تنظیم کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

حواشی

اختلافات ہوتے لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی کا کتنا حصہ ہے اور وہ ان اختلافات کے کس حد تک ذمہ دار تھے؟ حضرت گنگوھوی محدث تھے، فقیہہ تھے، مفتی تھے، مرشد راہ طریقت تھے، مصلح عوائد و رسوم تھے درس و تدریس حدیث و فقہ، افتاء و تعلیم و ارشاد ان کا شب و روز کا معمول تھا اور اسی کے لئے ان کی زندگی وقف تھی اگر انہوں نے تعلیم و تلقین اور اصلاح و ارشاد اور تزکیہ و تہذیب کے لئے کسی طالب علم یا کسی مرید یا مرشد سے کوئی بات کہی تھی یا شریعت کا کوئی مسئلہ بیان کیا تھا اور لوگ اسے لے اڑے تھے اور کوچہ و بازار کی چیز بنا دیا تھا تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اختلاف و نزاع کا الزام ان کے سر تھوپ دیا جائے؟ کیا وہ سیرت و سنت اور حدیث نہ پڑھاتے، فقہ کے مسائل نہ بتاتے، فتویٰ نہ دیتے، تعلیم و ارشاد سے ہاتھ اٹھا لیتے؟ ان کا تو کام ہی یہ تھا، یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا، یہ باتیں ان کے فرائض میں شامل تھیں وہ انہیں کیسے چھوڑ سکتے تھے دیکھنا تو یہ چاہیے کہ آیا انہوں نے اپنی مسند درس و تدریس، حدیث و فقہ سے

اٹھ کر منصب افتاء و تعلیم وارشاد کو ترک کر کے کوئی اختلافی مسئلہ چھیڑا تھا کسی دوسرے مسلک و مکتب کے خلاف کوئی رسالہ لکھا تھا اور کسی معاصر یا متقدم کے خلاف کوئی مجلس اختلاف و نزاع سجائی تھی ؟ اگر ایسا نہیں ہوا تھا اور فی الواقع نہیں ہوا تو وہ اس کے ذمہ دار کیسے ہو سکتے تھے ؟

ڈاکٹر صاحب نے آگے بھی یہ الزام بزرگان دیوبند اور بانیان دارالعلوم پر لگایا ہے۔ شاید وہاں بھی کچھ عرض کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

(۲)　ڈاکٹر صاحب نے یہاں کوے کی حلت ' تمام دنیا کے مسلمانوں کے جذبات کے خلاف فتوی ' امکان کذب ' امتناع نظیر حضرت خاتم النبین ' مزارات پر عرس کے اجتماع ' فاتحہ و میلاد کے مروجہ طریقوں کے مسائل میں بزرگان دیوبند کے فتوے اور رویے کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب یہ نہیں کہتے کہ ان کے رویے یا فتوئ غلط تھے ڈاکٹر صاحب خود بھی اسی رویے کے تھے کہ خواہ دنیا کے جذبات کچھ ہوں لیکن اگر فتوئ کتاب و سنت کی روشنی میں یا کسی مسلک فقہ کے مطابق پوچھا جائے تو مفتی کا فرض ہے کہ کتاب و سنت یا اسی دائرہ عقائد یا اسی خاص مسلک کے مطابق دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب اور تمام مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ علی کل شئی قدیر ہے اور اس کی قدرت کاملہ کے منافی ہے کہ وہ "کچھ" کرنے سے عاجز ہو۔ سلسلہ نبوت اتمام کو پہنچا ' دین مکمل ہو گیا۔ سنت الہیہ قائم ہو چکی اس کا قیام و دوام ہی اس کی مشیت ہے اور یہ اس کی مشیت سے بعید ہے کہ وہ اپنی ٹھہرائی ہوئی سنت کے خلاف کرلے لیکن اس "قدرت" اس سے ماوار اور سب سے ماورا ہے۔

یہ بات فکر و اعتقاد و عمل کے کسی ایک دائرے تک ہی محدود نہیں پورے عالم انسانیت ' عالم حیوانات ' عالم نباتات و جمادات اور کل کائنات ارض و سما پر محیط ہے اللہ تعالیٰ نے توالد و تناسل ' نشو و نما ' حیات و موت لیل و نہار کی گردش ' موسموں کا تغیر و تحول ' شمس و قمر اور ثوابت و سیارگان کا سر و قیام کا ایک نظام ٹھہرا دیا ہے۔ یہ اس کی غیر غیر متبدل اور دائمی سنت ہے وہ اس کے خلاف نہیں کرتا اور کرے گا بھی نہیں۔ یہی سنت اس کی مشیت ہے۔ لیکن اگر کوئی محترم قاری یہ فرمائیں کہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی نفی کے مترادف اور ایک صحیح العقیدہ مسلمان کے ایمان کے خلاف ہے۔

حالات و وقت کے مطابق اچھے کام ہوتے رہیں ' خدمت دین ' تبلیغ اسلام ' اصلاح مسلمین و نوع انسانی کے نئے نئے پہلو اور نئے نئے میدان سامنے آئیں گے اور ان میں حصہ لے کر مسلمان سعادت دارین حاصل کریں گے لیکن اتمام نعمت الہی (دین) کے بعد کوئی عمل دین نہیں بن سکتا اور اسلام کے نظام عقائد و عبادات میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔

خلاف اسلام اور کسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کے لئے مضر رساں اور نقصان دہ رسموں کے ڈاکٹر صاحب اور ہر معقول شخص اتنا ہی خلاف ہو گا جتنا کہ کوئی عالم دین ! کوئے کی اقسام کی شرائط کے ساتھ اس کی حلت و حرمت کا فقہ کی کتب میں ایک مسئلہ ضرور ہے کہ یہ ہماری زندگی کا مسئلہ نہیں۔ جن علماء نے کسی خاص قسم کے کوے کے حلال ہونے کا فتوئ دیا ہے ' کوا کھایا انہوں نے بھی نہ ہو گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اگر کسی نے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں یا کسی خاص فقہی

مذہب کے مطابق مسئلہ پوچھا تھا اور بتانے والے نے انہی شرائط کے دائرے میں بیان کر دیا۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ کوا حلال ہے اور اس کا کھانا شرائط ایمان میں سے ہے نہ انہوں نے اس کے لزوم طعام کیلئے کوئی تحریک چلائی۔ یہ جواب بھی تذکرہ الرشید کی چھ سات سطروں سے زیادہ طویل نہیں۔ اس تذکرے سے اگر ڈاکٹر صاحب کا مقصد ہو کہ یہ جواب دیا ہی نہیں جانا چاہیے تھا اور یہ توقع حضرت گنگوہی سے تھی تو یہ شکوہ مستفسر اور مستفتی سے کیوں نہ کیا جائے کہ اس نے ایسا سوال ہی کیوں پوچھا تھا کہ جو سوسائٹی کا مسئلہ ہی نہ ہو جس کی عملی قدر صفر ہو جب کہ مستفتی کے جواب میں خاموشی خلاف اخلاق ہو' اعراض معیوب' انکار دلیل عجز اور نص کتاب و سنت کا خلاف جواب دینا معصیت! یہ مسئلہ ان بزرگوں نے نہ اٹھایا تھا اور اس پر بحث و مناظرہ کیا تھا استفتا کا ضروری حد تک جواب دیا تھا اور یہ ان کا شرعی فرض تھا۔

وہ تمام اعمال جو آیہ تکمیل دین اور خیر القرون عہد نبوی کے بعد احداث ہوئے اور نص کتاب و سنت میں ان کے عمل و ترک کا کوئی حکم موجود نہیں' بدعت ہیں اور بدعت جلی و خفی اور درجات کے کم و بیش کے باوجود ضلالت ہے اور ضلالت میں حسنہ و سیئہ کی کوئی تقسیم نہیں اس میں ساری دنیا کے مسلمان مبتلا ہو جائیں تب بھی "بدعت" ضلالت ہی رہے گی حق اور صواب نہیں بن جائے گی۔ معیار حق کتاب و سنت ہے نہ کہ عوام کا تعامل اور انکی پسند' ناپسند یا کسی عالم دین کا فتویٰ! ان بزرگوں نے تو عرس و میلاد کے اجتماعات اور مروجہ فاتحہ و نیاز کو تو اریخ و ایام متعینہ اور شرائط خاص کے لزوم اور خلاف شریعت اعمال کے بغیر موجب خیر و برکت لکھا ہے اور ایصال ثواب کے تو وہ قائل ہیں اور اس پر ان کا عمل ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے حضرت حاجی صاحب امداد اللہؒ کے فیصلہ ہفت مسائل کے اختصار' جامعیت' زبان کی صحت اسلوب کی شائستگی جواب کی قاطعیت' مصنف کے مزاج کی نرمی' رویے کے اعتدال اور شرافت پر غور نہیں فرمایا یہی تمام خوبیاں مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاوی کی ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان پر سرسری نظر بھی ڈال لیتے تو ناممکن تھا کہ وہ ان کے دلائل کی محکمی تحریر کی مقبولیت' تحریر کی شرافت اور ان کے رویے کے اعتدال سے متاثر نہ ہوتے لیکن ڈاکٹر صاحب نے انکے فتوے کے جواب میں ایک بے نام ناقد کا حوالہ دیا ہے لیکن اس کی تحریر کی صحت و ثواب اور اس کی زبان و اسلوب بیان کی شرافت و معقولیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا البتہ اس بے نام شخص کی تنقید کے جواب میں مولانا خلیل احمد کے جواب الجواب کو غیر ضروری طور پر سخت ناپسندیدہ زبان میں قرار دیا ہے اگرچہ اس مقام پر کلام کی بہت گنجائش ہے لیکن اس سے صرف نظر کرتے ہیں اور یہ عرض کرتے ہیں کہ سب سے پہلے تو ڈاکٹر صاحب کو جواب الجواب کتاب و سنت کے خلاف اور غلط ثابت کرنا چاہیے تھا اگر ایک بات لوگوں کے ذوق و مزاج اور عادت کے خلاف ہے تو خواہ وہ کتاب و سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اس کے ترک کی دعوت انہیں گراں گزرے گی لوگوں کی پسند اور ان کی ملامت کو معیار تو نہیں بنایا جا سکتا۔ ہم یہاں غیر ضروری' بے موقع ناپسندیدہ' اشتعال انگیز' تمسخر آمیز' مذموم اور شرمناک بیان کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ تحریر ڈاکٹر صاحب کے بزرگ اور انہی کے مکتب فکر کے بانی و مبانی سر سید احمد کی ہے۔ سورۃ بقرۃ کی آیت ۲۵ وبشر الذین امنوا وعملوا الصلحت ان لھم جنت ..... ھم فیھا خالدون " کی تفسیر میں جنت کی تشریح و تعارف میں فرماتے ہیں: "یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے اس میں سنگ

مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں باغ میں سرسبز شاداب درخت ہیں۔ دودھ' شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں ہر قسم کا میوا کھانے کو موجود ہے۔ ساقی و ساقین نہایت خوبصورت' چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسین پہنتی ہیں۔ شراب پلا رہی ہیں' ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے ایک نے ران پر سر دھرا ہے ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں کچھ' ایسا بیہودہ پن ہے' جس پر تعجب ہوتا ہے اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں" (تفسیر القران جلد اول ، لاہور' مطبع گلزار محمدی ۱۸۵۱ء ص ۴۴)

کوئی آئے اور تفسیر کے مقدس فن کی اس تحریر کے مطالب کی صحت' زبان کی متانت' بیان کی معقولیت مفسر کے لہجے کی شرافت ثابت کر دے اور ڈاکٹر صاحب کی اخلاق و تعلیم و تہذیب تاریخ و سیاست میں ہزاروں صفحے جو سیاہ کئے ہیں ایک سطر ہی ان کے قلم سے اس تفسیر کی معقولیت یا غیر معقولیت میں دکھلا دے۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب بعض علمائے حق کے رویے کو اس بنا پر نشانہ تنقید بناتے ہیں کہ وہ بعض اہل دنیا کے نزدیک پسند نہیں کیا گیا تھا وہ اپنے پیر و مرشد کی تحریر کی تہذیب و شرافت ہی کو ثابت کر دیتے۔

مفتی کا کام صرف فتویٰ دینا ہوتا ہے وہ اس پر عمل کرانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ مستفتی ایک فتوی پوچھتا ہے مفتی اسے شریعت کا مسئلہ بتا دیتا ہے۔ مستفتی اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ مفتی کو اس سے غرض نہیں ہوتی اس کے برعکس مفسر صرف بیان کر دینے کے بعد بے نیاز نہیں ہو جا سکتا۔ تفسیر بیان کر دینے پر اس کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ مفسر بیان کردہ احکام و مسائل پر عمل کا داعی اور محرک بھی ہوتا ہے وہ تفسیر اسی لئے لکھتا ہے اگر یہ مقصد اور مطلوب نہ ہو تو تفسیر کی تالیف و اشاعت کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳)　ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہاں بھی وہی طرز فکر اختیار کیا ہے کہ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے بعض شرعی فیصلے کچھ مقامی لوگوں کو پسند نہیں تھے۔ حضرت شہیدین نے اسلامی حکومت کا قیام کا عزم کیا تھا تو گویا انہیں عوام سے پوچھ پوچھ کر ان کے جذبات کی روشنی میں فیصلے کرنا لازم تھے اور چونکہ اسلام کا یہ بنیادی رکن انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا اس لئے جو کچھ علاقے کی مقامی آبادی نے دشمنوں کی سازش اور انگیخت پر کیا وہ صحیح تھا! یا للعجب!

(۴)　ڈاکٹر صاحب نے مولانا احمد رضا خان بریلوی کے ظہور کے واقعے کا ذکر اس طرح فرمایا ہے جیسے یہ بھی کسی دیوبندی بزرگ کی غلطی کا نتیجہ تھا! اعلیٰ حضرت کی عمر تقریباً دس برس کی تھی تو دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تھا وہ درحقیقت دارالعلوم کے بانیوں کے نہیں ان کے شاگردوں اور خردوں کے معاصر تھے اس لئے انہیں بانیوں کے افکار و اعمال کے رد عمل کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا البتہ ان کا تعلق اور سابقہ اپنے معاصرین سے رہا تھا اور ناممکن تھا کہ ان کے منفی یا مثبت اثرات انہوں نے قبول نہ کئے ہوں پچیس تیس برس کے بعد کی تحریرات میں ان اثرات کا پتا چلتا ہے ان کے ذہن پر یہ اثرات کب اور کیسے مرتب ہوئے ہمارا یہ مسئلہ نہیں۔ ہمیں اس سے غرض ہے کہ وہ اثرات کیا تھے ان کے اثرات کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک نہ صرف دیوبند' تھانوی وغیرہ کافر تھے بلکہ وہ بھی جو اعلیٰ حضرت

کے فتوی کی صحت میں شبہ کریں اور دیوبندیوں اور تھانویوں کو کافر نہ سمجھیں دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی یہ بہ ایں سبب کہ پیر میخانہ علی گڑھ کے پیرو ہیں ان کے نزدکافر ہی ہیں مرے۔ الا یہ کہ انہوں نے سرسید کے عقائد سے توبہ کرلی ہو اور دیوبندیوں کے کفر پر بالا علان ایمان لائے ہوں۔

اعلیٰ حضرت بریلوی کے مقابلے میں کسی دیوبندی' تھانوی عالم نے ان کے فتاوی اور تحقیقات کی رو رد میں خواہ کچھ ہی لکھا ہو ان کے کفر اور دائرہ اسلام سے خارج ہونے کا کسی نے فتویٰ نہیں دیا کیا دیوبندیوں کے اعتدال و توازن اور شرافت کے ثبوت کے طور پر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ بات کافی اور لائق تحسین نہیں ؟

اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب دیوبندی عالم کی احکام الٰہی اور شریعت حقہ کے بیان میں صاف گوئی اور اصابت کو غیر ضروری طور پر سخت ناپسندیدہ زبان قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہی طرز فکر ہے تو ہم اپنی قسمت پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں ؟

(۵)　مجھے ڈاکٹر صاحب مرحوم سے نیازمندی کا تعلق ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ ان کے دامن کو حریفانہ کھینچا جائے اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آرہی ہے ایک شیر اور آدمی میں دوستی ہوگئی ایک روز ایک دیوار کے پاس سے دونوں گزر رہے تھے دیکھا دیوار پر ایک تصویر میں آدمی شیر کا گلا گھونٹ رہا ہے اور شیر بے بس ہے۔ آدمی نے اپنے دوست شیر سے پوچھا: "دیکھا آپ نے ؟" شیر نے جواب دیا "ہاں! برش آدمی کے ہاتھ میں تھا!" میں بھی اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ قلم ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں تھا!

ہندوستان میں مسلمانوں کے چند ادارے تھے جو تاریخ کے نہایت دور میں حالات اور وقت کے ناگزیر تقاضوں اور مسلمانوں کی اہم ضرورتوں کے تحت قائم ہوئے تھے۔

۱۔　دارالعلوم دیوبند اور اس مسلک کے دوسرے ادارے ..... قدیم تعلیم کے مراکز

۲۔　مدرسۃ العلوم علی گڑھ '(کالج بعدہ یونیورسٹی) ..... جدید تعلیم کا مرکز

۳۔　دارالعلوم ندوۃ العلماء' جسے دردمندان قوم نے قدیم وجدید کی خلیج پاٹنے اور تعلیم وتربیت کے بہترین سانچوں میں ڈھلی ہوئی بلند اخلاق' اعلیٰ وافکار' روشن خیال' اور پختہ سیرت کی نئی نسل تیار کرنے کے لئے قائم کیا تھا' ایسے گویا دیوبند اور علی گڑھ کی تعلیم کے بہترین نتائج کا مجمع البحرین ہوتا تھا۔

۴۔　جامعہ علمیہ اسلامیہ دہلی اور اس قسم کے دوسرے ادارے جو ۲۱۔۱۹۲۰ میں تحریک خلافت کے نتیجے میں ترک حوالات پروگرام کے تحت قائم کئے گئے تھے اور کہیں کہیں اب یہ تاریخی قومی یادگاریں باقی ہیں۔

ان میں سے دارالعلوم دیوبند اور اسکے برادر اداروں کے بارے میں اپنی مایوسی کا اظہار کر دیا ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی پیداوار اور اس کے نتائج سے اپنی بے زاری اور برأت کا اظہار بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی اسی تالیف علماء میدان سیاست میں کر دیا ہے اور چونکہ جامعہ علمیہ اسلامیہ دہلی نے علی گڑھ کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور اس کی حریف بن گئی تھی اس لئے ڈاکٹر صاحب اس سے بھی ناراض ہیں۔ اب لے دے کے علی گڑھ کالج رہ جاتا ہے' اسی کے بارے میں خاکسار نے

محترم ضیاالدین لاہوری کے مجموعہ مقالات "نقش سرسید" پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کالج کی تعلیم و تربیت کے ثمرات و نتائج پر جو کچھ لکھا تھا' آپ بھی اسپر ایک نظر ڈال لیں اور فیصلہ کریں کہ وہ کیا لاتا ہے جس کی یاد کا جشن منایا جائے؟ خاکسار نے دیکھا

"سرسید کی شخصیت صرف فراز کی شخصیت نہ تھی' وہ زندگی اور سیرت کے نشیب سے بھی آشنا ہوتی تھی انہوں نے قومی اصلاح و ترقی کے بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے' بلکہ ادب' تاریخ' صحافت وغیرہ میں بعض اولیات ان سے منسوب ہیں۔ لیکن اور مذہب و سیاست میں ان کے خیالات افکار اور اقدامات نے مسلمانوں میں پستی بے اعتمادی اور بے دینی پیدا کی۔ تعلیم میں ان کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہ تھا اور نہ اس کا کوئی متوقع نتیجہ نکلا۔ شبلی و ابوالکلام تو دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے' اس کے نتائج سے حالی بھی مطمئن نہ تھے ان کی تعلیم و تربیت کا شاہکار ان کا بیٹا وقت کا سب سے بڑا شرابی تھا جس نے اپنے باپ کو بڑھاپے میں گھر سے نکال باہر کیا تھا پھر کبھی اپنے گھر میں آنا انہیں نصیب نہ ہوا۔ پرانی تعلیم و تہذیب کے پروردہ ایک دوست نے اپنے گھر کا دروازہ ان پر کھولا اور پھر ان کے صحن سے سرسید کا جنازہ ہی نکلا۔ مذہب میں آزاد خیال اور ذوق محدود توسع کو اتنا دخیل کیا کہ پورا نظام عقائد و عبادات تہ و بالا ہو گیا۔ سیاست میں ان مرحوم نے وہ سبق دیا کہ مسلمان ملکی اور قومی دھارے سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ انگریزی حکومت پر اس اعتماد کی تعلیم دی کہ تحریک آزادی کے انتہائی عروج کے دور میں بھی مسلمانوں کے لئے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا تھا ان مرحوم کو زور شور کے ساتھ پاکستان کے مفکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر برصغیر کی سیاسی تحریک کو انہیں کے افکار کی روشنی میں چلایا جاتا تو نہ ہندوستان آزاد ہوتا نہ پاکستان ہی کا وجود نقش پذیر ہو سکتا تھا جو دل کی گہرائیوں سے انگریزوں کی حکومت کے دائمی و ابدی ہونے کی دعا کرتا ہو اور مسلمانوں کے لئے اسے خدا کی سب سے بڑی رحمت گردانتا ہو' اس کے افکار میں ہندوستان کی آزادی یا پاکستان کے تصور کی بھی کہاں گنجائش نکل سکتی تھی۔ سرسید کی شخصیت اور ان کی سیرت و خدمات کا کچھ اس طرح ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا مسلمانوں کے ذہنوں پر کسی نے جادو کر دیا ہو"۔ (نقش سرسید: ضیاءالدین لاہوری' کراچی' مکتبہ رشیدیہ' ۱۹۹۸' ص ۲۷۱)

(۶) صحیح نام "جنود ربانیہ" یا "لشکر نجات" ہے اور انگریزی میں "مسلم سالوشن آرمی" نام رکھا تھا۔

(۷) اولاً مسلمانوں کے سامنے ہی مقصد رہا تھا کہ وہ خود اپنی قوت بازو سے ملک کو آزاد کرا دیں گے۔ ۱۸۵۷ کے بعد تک اس انداز فکر کا پتا چلتا ہے لیکن بعد میں ان کے غور و فکر نے ثابت کر دیا کہ ملک کی آزادی حاصل کرنا اور انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنا تنہا مسلمانوں کے بس کی بات نہیں رہی۔ اس لئے سب کا رویہ بدلا اور سب نے برادران وطن سے اشتراک و تعاون کی راہیں استوار کیں۔ جماعتوں کے طریق کار میں بھی یہ بات شامل کی گئی۔ حکیم اجمل خان' ڈاکٹر انصاری' مولانا محمد علی' اقبال' محمد علی جناح' حسرت موہانی' ابوالکلام آزاد سب کا یہی مسلک تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبیداللہ سندھی کا رویہ غالب پاشا اور امیر حبیب اللہ خان کے مشوروں سے نہ بالا تھا لیکن ان کے مشوروں سے خیال ضرور پختہ ہو گیا تھا۔

(باقی صفحہ نمبر ۶۱ پر)